نہرو بال پستکالیہ
آزادی کی کہانی
(حصہ اوّل)
BAL PUSTAKALA
نیشنل بک ٹرسٹ
انڈیا
Govt.

نہرو بال پستکالیہ — ۱۲
آزادی کی کہانی
(حصہ اوّل)
مصنف: وشنو پربھاکر
مترجم: انور کمال حسینی

تصاویر
ایس۔ بھٹاچاریہ
نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، نئی دہلی

اپریل ۱۹۷۲ (چیتر ۱۸۹۴)

قیمت: ۱/۵۰

THE STORY OF SWARAJYA (URDU)

ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا A-5 گرین پارک نئی دہلی نے
شو چی پرائیویٹ لمیٹڈ دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔

آزادی کی کہانی

یہ کہانی اس وقت کی ہے جب ہندوستان پر انگریزوں کا راج تھا۔ ایک دن وہ اس ملک میں تجارت کرنے کے لیے آئے تھے اور پھر بن بیٹھے حاکم۔ تقریباً دو سو سال تک انھوں نے حکومت کی۔ اس دوران، ۱۹۴۷ء میں آزاد ہونے تک، کئی طریقوں سے ہندوستان نے انگریزوں کے تسلّط سے نجات پانے کی

کوشش کی ۔

۱۷۵۷ء میں ، پلاسی کے میدان میں ، بنگال کے نواب سراج الدولہ کو گوروں نے ہرایا تھا ۔ اس جنگ کے زبردست نتائج نکلے ۔ انگریز دوسرے راجاؤں اور نوابوں کی حکومتوں پر بھی قبضہ کرتے رہے اور آہستہ آہستہ سارے ملک پر ان کا تسلّط ہوگیا ۔

شروع شروع میں گورے دلّی کے مغل بادشاہوں کے دربار میں عام درباریوں کی طرح سے آتے تھے اور انھیں خراج دیتے تھے لیکن دھیرے دھیرے ان کا رویّہ بدلنے لگا ۔ بادشاہ شاہ عالم کے زمانے میں لارڈ ویلزلی کمپنی کے گورنر تھے ۔

انھوں نے ایک دن بادشاہ کے دربار میں کچھ تجویزیں بھیجیں ۔ وزیر نے ڈرتے ڈرتے بادشاہ سے کہا ، "جہاں پناہ ! کمپنی کے گورنر لارڈ ویلزلی نے کچھ تجویزیں بھیجی ہیں ۔"

بادشاہ نے پوچھا "کیسی تجویزیں ہیں ؟ ہم سُننا چاہتے ہیں ۔"

وزیر گھبرا گیا ۔ اچانک پڑھ نہیں سکا ۔ بادشاہ بولے ، "کیوں کیا بات ہے ، پڑھتے کیوں نہیں ؟" وزیر نے ہمت کی اور کہا ، "جہاں پناہ ، گستاخی معاف ہو ۔ گورنر ویلزلی نے لکھا ہے کہ وہ جہاں پناہ اور شاہی دربار کا مونگیر کے قلعے میں قیام پذیر ہونا تجویز کرتے ہیں ۔"

یہ سُن کر بادشاہ شاہ عالم غصے سے کانپ اٹھا ۔ بولا ، "کیا کہا ؟ ہم دلّی
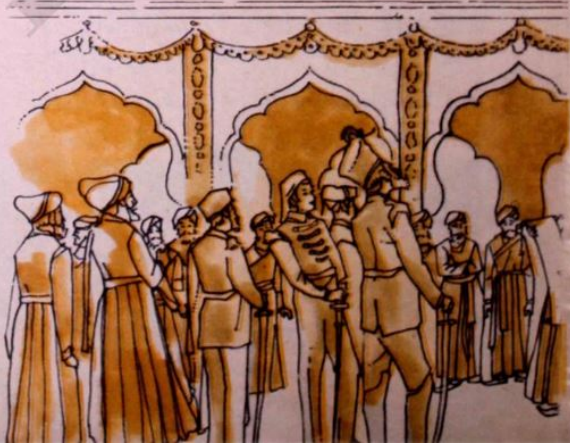
میں نہ رہیں گے، مونگیر میں رہیں گے؟ گورنر ہمیں دلّی سے ہٹانا چاہتا ہے؟ مغلیہ سلطنت کو دارالحکومت سے اُٹھانا چاہتا ہے؟ وہ ہندوستانی حکومت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے؟ جو دلّی پر حکومت کرتا ہے وہ سارے ہندوستان پر حکومت کرتا ہے۔ ہم بوڑھے ہیں تو کیا؟ ہماری رگوں میں تیموری خون دوڑ رہا ہے۔ ہم دلّی سے باہر نہیں جائیں گے۔ یہ ہندوستان کے بادشاہ کی بے عزّتی ہے۔ ان تجویزوں کو پھاڑ کر پھینک دو۔"

اُس وقت تو گورے گورنر کو اپنی تجویزیں واپس لینی پڑیں لیکن کچھ ہی دن بعد بادشاہی سچ مچ ایک بے عزّتی بن گئی۔ مغلوں کی حکومت لال قلعے تک محدود ہوگئی اور آہستہ آہستہ سارے ملک پر گوروں نے قبضہ جما لیا۔ یہی نہیں، چالاکی سے انھوں نے اودھ، ستارا، پنا، جھانسی، ناگپور، سمبل پور وغیرہ ریاستوں کو بھی اپنی حکومت میں ملا لیا۔

اب تو ایسٹ انڈیا کمپنی ملک کے بڑے حصوں پر حکومت کرنے لگی اور تجارت کے بہانے اپنی تجوریاں بھرنے لگی۔

آخر ناانصافی کا دور کب تک چلتا؟ ایک دن غریب بے زبان ہندوستانی بھی بھڑک اٹھے۔ ان کی خودداری جاگ اُٹھی۔ ان میں بے حد برداشت تھی لیکن اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے، جانور پر بھی اتنے ظلم کیے جائیں تو وہ بھی غصے میں بھر کر حملہ کر دیتا ہے۔ ہم تو انسان تھے، وہ ہمارے دیش کی دولت سے اپنا گھر بھر رہے تھے اور ہم غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے تھے۔

انتشار کی جو آگ اندر ہی اندر سُلگ رہی تھی وہ ۱۸۵۷ء میں بھڑک اٹھی۔ بہت سے راجا اور نواب غیر ملکی اقتدار کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ فوج نے

بغاوت کی۔ یہ تھی ہماری آزادی کی پہلی لڑائی جسے برٹش سرکار نے سپاہیوں کے غدر کا نام دیا۔

اس میں ہمیں کامیابی نہیں ملی۔ کیونکہ، جیسا کہ ہم نے پہلے کہا تھا، ہم لوگوں میں ابھی اتحاد نہیں تھا۔ ہم لوگوں میں قومی جذبہ نہیں تھا۔ ہم لوگ وطن سے محبت نہیں کرتے تھے۔ آپسی پھوٹ اور نااتفاقی کے سبب اس لڑائی میں ہم ہار گئے۔ بہت سے راجے مہاراجے اور کچھ عوام بھی گوروں کی مدد کر رہے تھے۔ ہمارے پاس ہتھیار بھی تو نہیں تھے۔ ایسی حالت میں ہم کیسے جیت سکتے تھے؟

برٹش پارلیمنٹ نے کمپنی کی حکومت ختم کرکے اب ملک پر براہِ راست اپنا قبضہ کر لیا۔ اس لڑائی میں انھوں نے بڑے بڑے ظلم کیے۔ جن کو انھوں نے باغی ٹھہرایا انھیں سخت سے سخت سزا دی۔ قیدیوں کو سنگینوں سے چھلنی کرکے انھیں زندہ آگ میں جلا دیا گیا۔

ہمیں خوش کرنے کو انھوں نے کچھ اچھی باتیں بھی کیں۔ اچھے وعدے بھی

کیے۔ انھوں نے کہا کہ کسی شخص کے مذہبی عقائد میں دخل نہیں دیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اب ہندوستان کی صنعت کو ترقی دی جائے گی اور ایسے ایسے کام کیے جائیں گے جس سے عوام کو فائدہ ہو۔

لیکن یہ سب ظاہر داری تھی۔ ہندوستانیوں کو اب بھی اونچی نوکریاں نہیں ملتی تھیں۔ اب بھی وہ ہتھیار نہیں رکھ سکتے تھے۔ اب بھی قحط پڑتے تھے!

اس سے بھی زیادہ دُکھ کی بات یہ تھی کہ ہندوستان کے کچھ حصّوں میں گوروں کو زمین دے کر ان کی بستی بسا دی گئی تھی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ ملک بھر میں انگریزی زبان اور تعلیم کی نشر و اشاعت کر کے ہندوستانیت ہی کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ طرح طرح کے ٹیکس اور مالگزاریاں لگاکر اور اپنے ملک کی مصنوعات ہمارے اوپر لاد کر ہمیں غریب اور بھوکا بنا دیا۔ پہلے ہم اپنے لیے ہی کپڑے نہیں بناتے تھے بلکہ باہر بھی بھیجتے تھے۔ ہندوستانی ململ اور چھینٹ کے تو دنیا بھر کے لوگ شائق تھے لیکن اب انگریزوں نے ہمارے دیش سے کپاس لے جاکر اپنے ملک میں کپڑوں کی ملیں کھولیں اور وہاں سے کپڑا بناکر ہندوستان بھیجنے لگے اور ہم دوگنے داموں پر اسے خریدنے لگے۔

انھوں نے ہم سے پانچ کروڑ روپوں کی کپاس خریدی، ولایت لے گئے اور وہاں سے پچپن کروڑ روپے کا کپڑا بھیج دیا۔ تو اس طرح انھوں نے ہمیں دیے پانچ کروڑ اور لیے پچپن کروڑ اور ہمارا پچاس کروڑ روپیہ غیر ملک چلا گیا۔ یہی تھی ان کی سیاست! تو ان باتوں کا کیا نتیجہ ہو سکتا تھا؟ یہی، نا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کے دلوں میں برٹش حکومت کے خلاف نفرت اور تلخی بھر جائے؟ اس تلخی کے سبب وہ نڈر ہو گئے۔

بنگال اور بہار میں انگریز نیل کی کاشت کرتے تھے اور 'نیلے صاحب' کہلاتے تھے۔ کسانوں پر یہ بہت ظلم کرتے تھے۔ ایک بار ایک نیلے صاحب کسی بات پر ناراض ہو گئے، انھوں نے ہاتھی کی سونڈ میں مشعل باندھ کر سارے گاؤں کو جلا دیا۔

کسان چیخنے چلاتے مجسٹریٹ کے پاس پہنچے۔ مجسٹریٹ نے پولس کو حکم دیا کہ نیلے صاحب کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ لیکن صاحب کے پاس تو پستول تھی پولس کا افسر اسے کیسے پکڑ سکتا تھا؟ اس زمانے میں بنکم چندر چٹوپادھیائے نامی ایک ڈپٹی مجسٹریٹ بھی تھے۔ جو 'وندے ماترم' گیت گا گا کر ہم نے آزادی کی لڑائی لڑی تھی، وہ انھوں نے ہی لکھا تھا۔ جب پولس افسر 'نیلے صاحب' کو نہیں پکڑ سکا تو بنکم بابو آگے آئے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ پھر صاحب کی پستول سے کیسے ڈرتے؟ وہ اسے گرفتار کر کے لے آئے — لے تو آئے لیکن وہ صاحب تو تھا انگریز۔ اس پر کالے ہندوستانی بنکم چندر کی عدالت میں مقدمہ نہیں چل سکتا تھا۔ لیکن بنکم چندر ہار ماننے والے نہیں تھے۔ بڑی عدالت میں اُس نیلے صاحب پر مقدمہ چلوایا اور خود گواہی دینے کے لیے گئے۔

انقلاب کی ابتدا

ہندوستانی اب جاگ اُٹھے تھے۔ انھوں نے یہ بھی سوچنا شروع کیا کہ آخر ہم غلام ہوئے تو کیوں؟ یقیناً ہمارے اندر کچھ خرابیاں، کچھ کمزوریاں ہوں گی، جن کے سبب انگلینڈ جیسا ایک چھوٹا سا ملک ہمیں دبا سکتا ہے!

انقلاب کی پہلی لہر بنگال میں آئی۔ غور و فکر اور خود کو پرکھنے کا یہ کام وہاں سے ہی شروع ہوا کیونکہ گورے سب سے پہلے وہیں آئے تھے۔ سب سے پہلے وہیں انگریزی تعلیم شروع ہوئی تھی۔ سب سے پہلے وہیں عیسائیت کے مبلّغ آئے تھے۔ آزادی کی پہلی لڑائی (۱۸۵۷ء) سے بہت پہلے راجا رام موہن رائے نے عیسائی مذہب کی تبلیغ کے خلاف آواز اُٹھائی تھی۔ لیکن انھوں نے یہ دیکھا کہ ہمارے دھرم میں بھی بہت سی بُرائیاں داخل ہوگئی ہیں، اسی وجہ سے بہت سے ہندو اپنے سماج کے جبر و ظلم سے گھبرا کر عیسائی بن رہے ہیں۔ راجا رام موہن رائے نے سوچا کہ پہلے ہمیں ان بُرائیوں کو دور کرنا چاہیے۔

یہی سوچ کر انھوں نے 'برہمو سماج' کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے بہت سے دیوی دیوتاؤں کی جگہ ایک خدا کی عبادت کا پرچار کیا۔ ہندو دھرم میں جو بھی برائیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ جیسے ستی کی رسم، کئی کئی شادیاں، لڑکی بیچنے کی رسم وغیرہ، راجہ رام موہن رائے نے ان سب کی مخالفت کی اور تعلیم نسواں پر زور دیا۔ انھوں نے ہندوستانیوں کو بڑی بڑی نوکریاں دینے، لگان کم کرنے اور کسانوں کے حقوق پر بھی زور دیا۔ اسی لیے راجا رام موہن رائے کو قومی انقلاب کا بانی کہا جاتا ہے۔

راجا رام موہن رائے

ج

ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ایسے ہی احتجاج ہونے لگے۔ پرانے رسم و رواج کو توڑنے اور ملک میں تعلیم کی اشاعت کرنے کے لیے ایک بے چینی سی پھیلنے لگی۔ ان مصلحین اور باہمت رہبروں نے نئے سماجوں کی بنا ڈالی۔ ۱۸۶۷ء میں شری کیشو چندر سین نے بمبئی میں 'پرارتھنا سماج' قایم کیا۔ جس کا بنیادی نظریہ تھا کہ خدا

ایک ہے۔ یہ سماج مورتی پوجا، بچپن کی شادی اور ذات پات کا مخالف، اور تعلیم نسواں، عقدِ بیوگان اور اچھوت سدھار کا مبلغ تھا۔ اس سماج کا مہاراشٹر کی زندگی پر بہت اثر پڑا۔

اس کے تقریباً آٹھ سال بعد ۱۸۷۵ء میں شمالی ہندوستان میں سوامی دیانند سرسوتی نے 'آریہ سماج' قایم کیا۔ انھوں نے کہا "وید سب سے پرانی کتابیں ہیں۔ ان کی تعلیم کے مطابق عمل کرکے ہم ترقی کرسکتے ہیں۔" 'برہمو سماج' اور 'پرارتھنا سماج' کی طرح یہ سماج بھی مورتی پوجا، بچپن کی شادی اور ذات پات کا مخالف تھا۔ سوامی جی نے ہندی کو قومی زبان تسلیم کیا اور اس کی تعلیم کے لیے 'گردکل' (مدرسے) کھولے۔
سوامی جی نے سب سے پہلے یہ نعرہ لگایا کہ ہندوستان ہندوستانیوں کا ہے اور کسان راجاؤں کا راجا ہے۔ انھوں نے کہا "کوئی کتنا بھی کرے لیکن اپنا راج ہی سب سے اچھا ہوتا ہے۔"

کچھ دن بعد بنگال میں سوامی رام کرشن پرم ہنس کے شاگرد سوامی دویکانند نے اس تحریک کو اور آگے بڑھایا۔ سوامی دویکانند کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہندو دھرم سب سے بڑھ چڑھ کر ہے اور ہماری قدیم تہذیب میں آدمی کو انسان بنانے کی مکمل قوت موجود ہے۔ انھوں نے کہا "ہندوستانیوں کو ایک بار پھر دنیا فتح کرنی ہے۔ یہ میری زندگی کا خواب ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہی آپ سب کی زندگی کا خواب بھی بنے۔ آپ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں جب تک کہ خواب کی تکمیل نہ ہو۔" ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ بھارت دوسرے ملکوں کی زمین پر قبضہ کرے۔ ان کا کہنا تھا کہ بھارت کی تہذیب، تعلیم اور روحانیت دوسرے

ملکوں میں پہنچاؤ اور انھیں متاثر کرو!

تعلیم اور اصلاح کی یہ تحریک اس طرح چلی کہ ملک میں ایک نئی جان سی پڑ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دبیز کہرے کو کاٹ کر سورج نکل آیا ہو۔ یہ رہبر اور نیتا ہندوستان کی آزادی کے پیشرو تھے۔ انگریزوں کا ماتھا ٹھنکا۔ اب وہ چین کی نیند نہیں سو سکتے تھے۔ انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ ہندوستانیوں کے دلوں میں اب آزادی کی تڑپ پیدا ہوگئی ہے۔ انگریزوں کے لیے تو ہندوستان سونے کی چڑیا تھا، اسے وہ بھلا کیسے چھوڑتے؟

قلمکاروں پر بھی اس تحریک کا زبردست اثر پڑا جو کہ فطری ہی تھا۔ اس زمانے میں کچھ شاعر اور ادیب تو ایسے ہوئے جنھوں نے آزادی کا پیغام دور دور

سوامی دیانند

مہادیو گووند راناڈے

بنکم چندر چٹو پادّھیائے کا ایک ناول ہے "آنند مٹھ"، اسی ناول میں انھوں نے اپنا مشہور گیت "وندے ماترم" لکھا ہے۔ اسی گیت میں "ارضِ مادرِ ہند" کی توصیف کی گئی ہے:

ماں! میں تیرے قربان
ماں، میری پُر قوت ماں
تیری آزادی میری زندگی ہے!

ہماری آزادی کی لڑائی میں اس گیت کی بہت اہمیت رہی۔ آسمان میں جھنڈا لہراتے ہوئے جنگ آزادی کی سپاہ کے جتھے کے جتھے "وندے ماترم" گاتے اور پولس کی

تک پہنچایا۔ ان کے قلم کی طاقت نے سوتے لوگوں کو بھی جھنجھوڑ دیا۔ ہندی کے مشہور ادیب بھارتیندو ہریش چندر نے سماج کی خرابیوں پر سخت چوٹ کی۔ تعلیم کا پرچار کیا، حُبِّ وطن کے گیت گائے اور سودیشی اشیاء کے استعمال کرنے کے لیے ایک حلف نامے پر لوگوں کے دستخط کروائے۔ انھوں نے ہم وطن ساتھیوں کو للکارا، "بھائیو! اب ایک ہو جاؤ اور متحد ہو کر ان (انگریزوں) کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔ ایسا کام کرو کہ ملک کی دولت باہر نہ جانے پائے۔"

اپنی مزاحیہ شاعری میں بھی وہ گوروں پر طنز کرنے سے نہیں چوکے۔ جیسے:

"چورن صاحب لوگ ہیں کھاتے سارا ہند ہضم کر جاتے"

لاٹھیوں کا مقابلہ کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے جس طرح ہندوستانیوں پرظلم کیے تھے اس سے لوگ بہت ڈر گئے تھے لیکن پھر بھی عوام میں بغاوت کا جذبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ سکھوں کی ایک جماعت تھی جس کا نام 'نامدھاری سامپرادائے' تھا، انھیں 'کوکا' بھی کہا جاتا ہے۔ اس جماعت میں زیادہ تر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پُرانے سپاہی تھے، جو بعد میں فوج سے علیحدہ ہوکر بھگت بن گئے تھے، لیکن ان کا لباس سپاہیوں جیسا ہی تھا۔ بھگتی کے ساتھ ساتھ یہ لوگ ملک کی آزادی کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔

پنجاب کے ضلع لدھیانہ میں 'بھیریں صاحب' میں ان کی گدی تھی۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس زمانے میں گرُو رام سنگھ گدی نشین تھے۔ وہ بہت بڑے محبِ وطن تھے۔ وہ سودیشی چیزوں کا ہی استعمال کرتے تھے۔ پیام رسانی (ڈاک) کے لیے ان کے اپنے ذرائع تھے۔ ان کی جماعت بہت مضبوط تھی۔ انھوں نے انگریزی تعلیم، عدالت، ریل، تار اور ڈاک غرضکہ سب کا بائی کاٹ کر دیا تھا۔

وہ اس ملک سے انگریزوں کی حکومت کو ختم کر دینا چاہتے تھے اس لیے یہ لازمی تھا کہ فرنگی سرکار ان پر پابندیاں لگا دیتی لیکن کئی سال بعد کئی وجوہ سے یہ پابندیاں ہٹالی گئیں۔ پابندیاں تو ہٹالی گئی تھیں لیکن دل میں سرکار بھی

چاہتی تھی کہ کسی بھی طرح یہ تحریک آزادی پنپنے نہ پائے۔

آخر سرکار نے اس کو کچلنے کا ایک راستہ نکال ہی لیا۔ مالیر کوٹلہ کی ریاست کا حکمراں انگریزوں کا پٹھو تھا۔ فرنگی حکومت نے اسے 'کوکوں' کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ اسی لیے ۱۸۷۲ء کی جنوری میں جب کوکوں کا ایک گروہ 'ماگھی اشنان' کے لیے امرتسر جارہا تھا تو راستے میں مالیر کوٹلہ کے باشندوں نے انھیں پریشان کرنا شروع کردیا۔ پہلے تو وہ خاموش رہے لیکن جب مالیر کوٹلہ کے باشندوں کی شرارت انتہا کو پہنچ گئی تو کوکے، بگڑ اُٹھے۔ انھوں نے جم کر لڑائی کی۔ وہ مالیر کوٹلہ کے حاکم کے محلوں اور قلعہ تک پہنچ گئے۔

گرُو رام سنگھ نے 'کوکوں' کو ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی کیونکہ انقلاب کی تیاری ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی لیکن بات کافی آگے بڑھ چکی تھی، اسی لیے کچھ لوگوں نے گروجی کی بات نہیں مانی۔ سرکار یہی چاہتی تھی۔ موقعہ پاکر لدھیانہ کا انگریز ڈپٹی کمشنر وہاں پہنچ گیا اور اس نے 'کوکوں' پر زوردار حملہ کیا۔ وہ بہت بہادری سے لڑے۔ بہت سے لوگ اس لڑائی میں کام آئے۔ ۶۸ آدمیوں کو ڈپٹی کمشنر نے گرفتار کر لیا، اور ان میں سے ۵۰ آدمیوں کو توپ سے اُڑا دیا گیا۔ کچھ کو پھانسی دے دی گئی۔ توپ سے اڑائے جانے والوں میں تیرہ برس کا ایک لڑکا بھی تھا۔ اس بھولے بھالے بچے کو دیکھ کر ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو بڑا رحم آیا۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا:

"یہ تو ابھی بچہ ہے، اسے گمراہ کیا گیا ہے، اسے معاف کردو۔"

ڈپٹی کمشنر نے کہا "اچھا، اگر یہ کہدے گا کہ یہ باغی رام سنگھ کا پیروکار نہیں ہے تو ہم اسے چھوڑ دیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے اس لڑکے کو اپنے پاس بلایا اور کہا "دیکھو ہماری میم صاحب کو تم پر رحم آتا ہے۔ تم اگر یہ کہدو کہ تم اس شیطان کے بچے رام سنگھ کے پیروکار نہیں ہو تو تمھیں چھوڑ دیا جائے گا۔"

اپنے گرو کے لیے گستاخانہ الفاظ سُن کر وہ لڑکا غصے سے بھر گیا، اس نے زور لگاکر خود کو سپاہیوں کی گرفت سے چھڑا لیا اور بھاگتا ہوا ڈپٹی کمشنر کے پاس پہنچا اور اس کی ڈاڑھی کھینچتا ہوا وہ بولا "تم میرے گرو کو گالی دینے والے ہوتے کون ہو؟"

ڈپٹی کمشنر غصے سے پاگل ہوگیا لیکن وہ لڑکے کو اپنے سے الگ نہیں کرسکا۔ آخر اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا "اس شیطان کے بچے کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔"

ایک سپاہی نے اس کے ہاتھ قلم کردیے۔ اس کے بعد اسے توپ کے مُنہ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ جنگِ آزادی کی تاریخ لکھنے والوں نے اس حادثہ کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس بہادر بچے کا کیا نام تھا، یہ کسی نے نہیں لکھا۔ اس تحریک کو اس بے رحمی سے دبایا گیا اور گرو رام سنگھ کو گرفتار کرکے برما لے جاکر نظربند کردیا گیا اور وہیں پر ان کی موت ہوئی۔

انگریزوں کی حکومت سے پہلے اس ملک میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو آپس میں ہمیشہ برسرِپیکار رہتی تھیں۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کو مضبوط بنانے کے لیے یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم کردیں۔ ان کا نعرہ تھا "ایک ملک، ایک حکومت اور ایک جیسے اصول و قوانین۔"

اس کی مخالفت بہت کی گئی اور اس سے اتحاد و ایکتا کا جذبہ بھی پیدا ہوا، جو انگریزوں کے مظالم کے سبب اور بھی مضبوط ہوگیا۔ لوگ سمجھنے لگے کہ ہم سب کا

فائدہ اسی میں ہے کہ ہم ایک ہوجائیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ملک بھر میں ریل، ڈاک اور تار کی سہولت ہوجانے سے ایک دوسرے کی خیر و خبر جاننا اور رابطہ قایم رکھنا بہت آسان ہوگیا تھا۔ تجارت اور صنعتوں کو بھی اس سے بہت فائدہ پہنچا۔ چھاپے خانے بھی قایم ہوئے اور اخبار بھی شایع ہونے لگے۔

اُس زمانے میں ان اخباروں کے ایڈیٹر بڑے بڑے عالم فاضل اور عوامی لیڈر ہوتے تھے۔ جب وہ اپنے اخباروں میں دیش بھگتی کی تحریک چلانے کے ساتھ ساتھ حکومت کے مظالم کی اشاعت کرتے تھے تو لوگ انھیں پڑھ کر حکومت کے مخالف بن جاتے تھے۔ سرکار ان اخباروں سے بہت گھبراتی تھی۔ اسی لیے ۱۸۷۸ء میں 'ورنا کلر پریس ایکٹ' پاس کرکے انگریزی کے علاوہ دوسری زبانوں کے اخباروں پر پابندی لگا دی گئی کئی اخبار بند ہو گئے لیکن اب تک ہماری نیند ٹوٹ چکی تھی۔ ملک بھر میں ہلچل مچ گئی۔ اس ملک کے عوام میں انقلاب کے جذبات پیدا ہو رہے تھے لیکن اس کا فائدہ تو تبھی ہوتا جب ایسے محب وطن لوگ متحد ہوکر کام کرتے لیکن اس وقت اتحاد قایم کرنا بہت مشکل تھا۔ چوری چھپے کچھ ادارے دوسرے ناموں سے کام کرتے رہتے تھے۔ ہمت کرکے

کچھ لوگوں نے ایک آدھ جماعت بنائی بھی لیکن وہ زیادہ دن چل نہ سکی، جیسے ۱۸۷۶ء میں بنگال میں ایک جماعت بنائی گئی جس کا نام انڈین ایسوسی ایشن رکھا گیا۔ شری سریندر ناتھ بنرجی اس ادارے کے بانی تھے۔ اپنی جماعت کی تشہیر کے لیے انھوں نے سارے ملک کا دورہ کیا۔ انگریزوں نے جو برے قانون بنائے تھے ان کے خلاف پروپگنڈہ کیا۔

یہ برے قانون زیادہ تر وائسرائے لارڈ لٹن کے زمانے میں بنے تھے۔ ہندوستانی ان سے بہت ناراض تھے، لیکن ان کے بعد جو نئے وائسرائے آئے، وہ بہت مہربان تھے۔ ان کا نام لارڈ رپن تھا۔ انھوں نے 'ورنا کلر پریس ایکٹ' کو رد کر دیا اور 'البرٹ بل' پیش کر کے نئے عہد کی ابتدا کرنا چاہی۔ اب تک ہندوستانی مجسٹریٹ کی عدالت میں گورے ملزموں پر مقدمہ نہیں چلایا جاتا تھا۔ اس بل کا مقصد اس رکاوٹ کو ختم کرنا تھا۔

اس پر انگریز بہت بگڑے اور اتنے مخالف ہوئے کہ انھوں نے لارڈ رپن کو زبردستی جہاز پر چڑھا کر انگلینڈ واپس بھیجدینے کی سازش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصل بل قریب قریب ہٹا لیا گیا۔ بس، اتنی بات مان لی گئی کہ ضلع مجسٹریٹ اور سیشن جج کو یہ اختیار رہے گا۔

گوروں کو یہ جو کامیابی ملی اس سے ہندوستانی اور بھی بھڑک اُٹھے۔ وہ سمجھ گئے کہ اپنی اس حرکت کے ذریعے گورے اپنے اور ہندوستانیوں کے درمیان یہ فرق قایم رکھنا چاہتے ہیں جو حکمراں اور محکوموں میں ہوتا ہے۔ ان سب حالات کے پیشِ نظر کچھ وطن دوستوں نے ۱۸۸۲ء میں ایک سیاسی جماعت کی تشکیل کی۔ اس جلسہ میں بنگال کے دو مشہور لیڈر، سریندر ناتھ بنیرجی اور آنند موہن باسو موجود تھے۔ اس زمانے میں سریندر ناتھ بنیرجی نے اپنے اخبار "بنگالی" میں ایک انگریز جج کی مخالفت بھی کی جس کے نتیجے میں وہ دو مہینے کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔ اس دن ایک زبردست مجمع جلوس بناکر عدالت پہنچا۔ اشوتوش مکرجی اور چترنجن داس بھی اس جلوس میں شامل تھے۔ یہ دونوں آگے چل کر بہت بڑے لیڈر بنے۔ اس وقت عوام میں انگریزوں کے خلاف جس قدر نفرت نظر آئی۔ صوبوں میں جس قدر محبت بڑھی اور آپسی اتفاق کا جس قدر اظہار ہوا، ویسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے جب سریندر ناتھ بنیرجی جیل سے رہا ہوئے تو ان کا ایک عظیم الشان استقبال کیا گیا۔ ان پر اٹلی کی آزادی کے لیے لڑنے والے رہبروں، گیری بالڈی اور میزینی کا بہت اثر پڑا تھا۔ وہ جہاں کہیں جاتے اپنی تقریر کے آخر میں عوام سے یہ ضرور پوچھتے "آپ میں سے کون گیری بالڈی اور میزینی ہوگا؟"

جواب میں عوام ایک ہوکر کہتے "ہم ہوں گے، ہم ہوں گے!!"

آہستہ آہستہ عوام میں دیش بھگتی کا جذبہ تیز ہوتا گیا۔ وہ اپنے دیش کو آزاد کرانے کے لیے بے چین ہو اُٹھے تھے۔

کانگریس کا قیام

عوام میں بہت بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ ایک طرف تو صنعتوں کی تباہی سے غریبی اور بے کاری بڑھ رہی تھی، دوسری طرف سرکار ایسے قانون بنا رہی تھی جن سے تعلیم یافتہ طبقہ بھی خوش نہیں تھا۔ سمجھدار لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بھی وقت بغاوت ہوسکتی ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو مسلح بغاوت میں یقین کرتے تھے۔ اندر ہی اندر چاروں طرف چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔

ایسے وقت میں ایک شخص نے ایسا ذریعہ تلاش کرنے کی کوشش کی جس سے عوام کو اپنی ناپسندیدگی کو ظاہر کرنے کا راستہ مل سکے۔ اصل میں فرنگی سرکار کے کچھ اونچے عہدیدار یہ سمجھنے لگے تھے کہ ایک ایسی جماعت بنا دینی چاہیے جس کے اسٹیج سے تقریریں کرکر کے اپنے دل کا غبار نکالا جا سکے۔ ان کا خیال تھا کہ پڑھے لکھے لوگ تقریریں ہی کر سکتے ہیں، انقلاب نہیں لا سکتے۔

انگریزوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے اور سرکار کے مظالم کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ایسے ہی انگریزوں میں ایک انگریز ایلن آکٹیوین ہیوم بھی تھے۔ ان کے خیالات بہت ہی بلند تھے۔ سرکار کی پالیسی سے انھیں ہمیشہ اختلاف رہا۔ وہ پہلے محکمۂ زراعت میں سکریٹری تھے لیکن بعد میں انھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ انھوں نے یکم مارچ ۱۸۸۳ء کو کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹوں کے نام ایک خط لکھا۔ اس میں انھوں نے کہا "اگر ملک

کے کچھ بلند خیال اور تعلیم یافتہ لوگ اپنے ذاتی فائدے سے اوپر اُٹھ کر قومی مفاد کا کوئی کام نہیں کر سکتے تو کہنا پڑے گا کہ ان کے ساتھ جو برتاؤ ہو رہا ہے وہ مناسب ہی ہے۔ اگر ملک کے چنیدہ لوگ بھی اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے یکجا نہیں ہو سکتے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم جو آپ کے دوست ہیں، غلطی پر ہیں اور ایسے حالات کے تحت موجودہ حکومت سے بہتر کی نہ تو ہندوستان خواہش کر سکتا ہے اور نا ہی وہ اسے مل سکتی ہے۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو نہ تو آپ کو شکایت کرنی چاہیے اور نا ہی کوئی تحریک چلانی چاہیے اور نا یہ کہنا چاہیے کہ آپ کو بندھنوں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ پھر میں یہی کہوں گا کہ انگریزوں کا حکمراں بننا مناسب ہی ہے۔"

انھوں نے پچاس ایسے آدمیوں کی مانگ کی جو خود دار اور مخلص ہوں اور جن میں اخلاقی جرأت ہو۔ اُنھوں نے اس سلسلہ میں لارڈ ڈفرن سے بات کی۔ لارڈ ڈفرن نے ایک ایسی سماجی جماعت بنانے کا مشورہ دیا جس کا صدر گورنر نہ ہو بلکہ کوئی دوسرا آدمی ہو۔

ہیوم نے لارڈ ڈفرن کے اس مشورے کو ملک کے سیاسی رہنماؤں کے سامنے رکھا وہ لوگ اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ اس خیال کا بانی مبانی لارڈ ڈفرن ہے اور حقیقت میں اس کا مقصد ہندوستان کو سیاسی آزادی دلانا اتنا نہیں ہے جتنا برٹش سامراج کو خطرے سے بچانا۔

لیکن کچھ بھی ہو، یہ طے کیا گیا کہ بڑے دنوں کی تعطیل میں ملک کے سبھی حصوں سے منتخب نمائندوں کا ایک اجلاس پونا میں بلایا جائے لیکن عین وقت پر پونا میں ہیضہ پھیل گیا، اس لیے یہ اجلاس وہاں نہیں ہو سکا۔ اس کا پہلا اجلاس بمبئی میں ہوا۔

اے، او، ہیوم

لارڈ ڈفرن نے اس وقت خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا کہ جو کانگریس ان کی دعاؤں کے ساتھ قایم کی جا رہی ہے وہ ایک دن انگریزوں کی حکومت کو ہی ختم کر دے گی۔ اگر سوچا ہوتا تو وہ اس اجلاس کو کبھی نہ ہونے دیتا۔

یہ کانفرنس، گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج، میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں شامل ہونے والے بہت سے لوگ آگے چل کر جنگ آزادی کے بڑے بڑے لیڈر بنے

اور بہت مشہور ہوئے۔ اُس دن ان عظیم محبان وطن کے ساتھ انگریز سرکار کے کچھ وفادار بھی شامل ہوئے تھے۔ اس وقت تو اس کانفرنس کا مقصد تھا، انگریز سرکار کے تعاون سے ہندوستان کی ترقی کے لیے کام کرنا۔

۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو دن کے بارہ بجے گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج کے ہال میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ کانگریس کے اس پہلے اجلاس کے پہلے مقرر تھے اے، او، ہیوم۔ ان کے بعد ایس، سبرامنیم اور کاشی ناتھ ترمبک تیلنگ نے تقریریں کیں۔ صدارت امیش چندر بنرجی نے کی۔ وہ بڑا عظیم اور تاریخی لمحہ تھا۔

اس اجلاس میں جو تجاویز پاس ہوئیں، ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور کے محبان وطن کا دل کس طرح کام کرتا تھا۔ جیسے ایک تجویز میں یہ مانگ کی گئی کہ ہندوستان کی حکومت کی کارکردگی کی جانچ کے لیے ایک رایل کمیشن بٹھایا جائے۔ دوسری تجویز میں انڈیا کونسل کو توڑ دینے کے لیے کہا گیا۔ پہلے لیجسلیٹو اسمبلیوں میں نمائندے نامزد کیے جاتے تھے، اس اجلاس نے یہ مانگ کی کہ یہ سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ ایک دوسری تجویز میں یہ مانگ کی گئی کہ آئی، سی، ایس کا امتحان انگلینڈ اور ہندوستان دونوں جگہ ہو۔ فوج پر کیے جانے والے خرچ میں کمی کرنے کی بھی مانگ کی گئی اور آخر میں 'ملکہ معظمہ وکٹوریہ زندہ باد'، کے نعروں کے ساتھ اجلاس کا اختتام ہوا۔

کانگریس جلد ہی سارے ملک میں پھیل گئی۔ سب ہی علاقے، سب ہی قومیں، سب ہی مذاہب، غریب امیر، کسان مزدور، عورت مرد، شہری دیہاتی، غرضکہ سب ہی لوگ اس میں شامل ہونے لگے۔ کانگریس جلد ہی ایک قومی جماعت بن گئی

جو ملک بھر کی مانگوں کی نمائندہ تھی۔

لیکن یہ سب ایکدم ہی نہیں ہوگیا۔ پورے بیس سال تک کانگریس نے قانونی ذریعوں کا ہی سہارا لیا، ہنگاموں کے وہ خلاف تھی۔ انگریزوں کے انصاف پر تو اس کو اس قدر یقین تھا کہ فیروز شاہ مہتا نے کہا "مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انگریز مدبر ہماری مانگوں پر ضرور توجہ کریں گے۔" اور ۱۸۹۶ء میں ہونے والے اجلاس کے صدر نے تو یہاں تک کہدیا کہ انگریزوں سے بڑھ کر ایماندار اور طاقتور قوم اس روشن سورج کے نیچے اور کوئی نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کانگریس کو عوام کے دکھوں سے پوری ہمدردی تھی لیکن وہ انھیں لوگوں کی ہمدردی اور خیر سگالی چاہتی تھی جن کے خلاف وہ لڑنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے لیڈروں کا عوام سے براہ راست تعلق نہیں تھا، ان کی وطن دوستی بھی برٹش سرکار کی وفاداری سے مشروط تھی اور اس کی بنیاد تیاگ اور قربانی پر نہیں تھی۔ اسی لیے ۱۹۰۶ سے پہلے مضبوطی کے ساتھ "سوراجیہ" کی مانگ پیش نہیں کرسکی، صرف 'سہولتوں'، ہی کی مانگ کرتی رہی۔

لیکن کچھ بھی ہو ہندوستان کی تاریخ کا نیا باب شروع ہوگیا تھا۔ عوام میں کھل کر مخالفت کرنے اور اپنے حق مانگنے کی قوت پیدا ہوگئی تھی۔

ابتدائی کانگریس کے رہنما

یہ درست ہے کہ ۱۹۰۵ء تک کانگریس جن لیڈروں کے ہاتھ میں رہی وہ ہمیشہ حکومت وقت کی وفاداری کی دہائی دیتے تھے اور اسی کی بنا اونچے عہدوں کی مانگ بھی کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ چھوٹی موٹی اصلاحات سے مطمئن ہوکر خاموش ہو جانے والے نہیں تھے۔ وہ سچے محب وطن اور ایماندار لوگ تھے۔ ان میں سے کچھ نے تو آگے چل کر انگریزوں کے خلاف کھل کر جنگ آزادی میں حصہ لیا۔

ان لیڈروں میں صرف ہندوستانی ہی نہیں تھے، انگریز بھی تھے۔ ان میں سے مشہور تھے۔ ایلن آکٹیوین ہیوم، سر ولیم ویڈر برن اور سر ہنری کاٹن۔ ہیوم صاحب کا ذکر تو ہم کر ہی چکے ہیں۔ وہ کانگریس کے بانی تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ ہندوستان کی فلاح وبہبود کے لیے کام کرتے رہتے تھے۔

وہ کئی سال تک کانگریس کے جنرل سیکریٹری رہے۔ سر ولیم ویڈر برن دو بار کانگریس کے صدر بنے۔ پہلی بار ۱۸۸۹ء میں اور پھر اکیس سال بعد ۱۹۱۰ء میں الہ باد کے اجلاس میں۔ سر ہنری کاٹن ۱۹۰۴ء میں بمبئی اجلاس کے صدر بنے تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے 'متحدہ ہندوستان' کا تصور پیش کیا تھا۔

ہندوستانی رہبروں میں دادا بھائی نوروجی کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ وہ ہندوستان کی 'نشاۃ الثانیہ' کے مرد بزرگ مانے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش بمبئی کے ایک پارسی خاندان میں ۴ ستمبر ۱۸۲۹ء کو ہوئی تھی۔ بچپن میں باپ کی موت ہو جانے کے سبب ماں نے ہی ان کی پرورش کی تھی۔ کچھ دنوں تک وہ معلم رہے پھر تجارت کرنے لگے۔ وہ ریاست بڑودہ کے دیوان بھی بنے لیکن انگریز عہدیدار سے اختلاف ہو جانے کے باعث انھوں نے وہ عہدہ چھوڑ دیا۔

انھوں نے تقریباً ۳۰ ادارے قایم کیے۔ کئی اخبار جاری کیے۔ تین بار (سن ۱۸۸۶ء ۱۸۹۳ اور ۱۹۰۶ء میں) کانگریس کے صدر بنے اور برٹش پارلیمنٹ کے صدر بھی چنے گئے۔ وہاں انھوں نے ہندوستان کے لیے ایک ذمہ دار حکومت کی مانگ بڑے زور شور کے ساتھ پیش کی تھی۔ لارڈ سالس بری نے انھیں 'کالا آدمی' کہا تھا لیکن جب انھوں نے ہندوستان کی بڑھتی ہوئی غریبی اور ٹیکسوں کی زیادتی کے خلاف تقریر کی تو برٹش پارلیمنٹ میں تہلکہ مچ گیا۔ ۱۹۰۶ء میں وہ تیسری بار کانگریس کے صدر بنے۔ اس وقت انھوں نے ہی 'سودیشی' اور 'سوراجیہ' کے نعرے ہندوستان کو دیے تھے۔ شری گوکھلے نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ اگر آدمیوں میں دیوتا کا ہونا ممکن ہے تو وہ دادا بھائی نوروجی ہیں۔ اس عظیم شخص کی موت ۳۰ جون ۱۹۱۷ء کو ہوئی۔

بنگال کے نیتا سریندر ناتھ بنرجی کی پیدائش ایک معزز خاندان میں ۱۰ نومبر ۱۸۴۸ء کو ہوئی۔ اپنی ذہانت سے آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا لیکن ایک معمولی سی غلطی پر انھیں برطرف کر دیا گیا۔ اس بات سے ان کا پورا کردار متاثر ہوا۔ وہ ایک جادو بیاں مقرر تھے اور انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے قوم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ وہ دو بار کانگریس کے صدر بنے تھے۔

ان کا اصول تھا کہ برٹش سرکار کا وفادار رہ کر ملک کی اصلاح کا کام کیا جائے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انگریزوں کی تہذیب تمام دنیا میں سب سے بڑھ کر

ایس ، این ، بنرجی

ہے اور یہ ہندوستانیوں کے واسطے ایک بہت بڑی نعمت ہے ۔ لیکن کچھ مدت بعد سیاسی حالات ان کے خلاف ہو گئے اور یہ جادو بیاں مقرر انگریزوں کا مصاحب سمجھا جانے لگا ۔ انھیں خیالات کے سبب آگے چل کر ۱۹۲۱ء میں وہ بنگال کے وزیر بنے اور ' سر ' کا خطاب پایا ۔ کانگریس سے اب ان کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا ۔ ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم کے بعد جب ایک زبردست تحریک چلی تو اس وقت وہ اس کے صف اول کے رہنماؤں میں تھے ۔ جب جب بھی ملک میں انتشار پھیلا ، انھوں نے ملک کے کونے کونے میں جاکر اس کے اسباب کی مخالفت کی ۔

ایک اور عظیم رہبر تھے گوپال کرشن گوکھلے جن کی پیدائش مہاراشٹر کے رتناگری نامی ضلع کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی ۔ بچپن میں ہی باپ کی موت ہو جانے کے سبب انھیں بہت ہی کٹھن اور صبر آزما زندگی گزارنا پڑی ۔ کئی بار تو انھیں ایک ہی وقت کا کھانا مل پاتا تھا اور وہ سڑک پر لگے لیمپوں کی روشنی میں پڑھا لکھا کرتے تھے لیکن تھے بے حد ذہین اور محنتی ۔ بعد میں پونا انگریزی اسکول میں معلم ہو گئے ۔ آگے چل کر یہ اسکول فرگوسن کالج کے نام سے مشہور ہوا ۔ وہ اس کالج کے پرنسپل کے عہدے تک پہنچے لیکن صرف پچھتر روپے ماہوار ہی لیتے رہے ۔ بقیہ تنخواہ غریبوں کے لیے دیدیتے تھے ۔ تعلیم ختم کرنے کے فوراً بعد وہ پونا کے بے تاج بادشاہ جسٹس مہادیو گووند رانا ڈے کی قربت میں آئے ۔ رانا ڈے گوکھلے کی ذہانت سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے گوکھلے کو بمبئی کی ایک سیاسی جماعت " سارو جینک سبھا " کا سکریٹری بنا دیا ۔ ابھی وہ صرف ۳۳ برس کے ہی تھے کہ بمبئی کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر چن لیے گئے ۔ جلد ہی وہ مرکزی اسمبلی کے ممبر بن گئے جو ' امپیریل لجلیٹو اسمبلی ' کہلاتی تھی ۔

کانگریس میں وہ سب سے پہلے ۱۸۸۹ء میں لوکمانیہ تلک کے ساتھ آئے تھے ۔ اس وقت نمک کے قانون کی مخالفت کرتے ہوئے انھوں نے یہ بتایا تھا کہ کیسے ایک پیسے کے نمک کی قیمت پانچ آنے ہو جاتی ہے ۔ جس زمانے میں

گوپال کرشن گوکھلے

گاندھی جی جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے لڑ رہے تھے، اس وقت وہ وہاں گئے تھے اور انھوں نے گاندھی جی کی بڑی مدد کی تھی۔ انھوں نے سب سے بڑا جو کام کیا وہ تھا "سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی" کا قیام۔ یہ سوسائٹی مخلص محبان وطن کی تھی جو اپنی آمدنی میں صرف اپنے گذارے بھر کے لیے رکھ کر بقیہ سب کچھ غریبوں کے لیے خیرات کر دیتے تھے۔ گوکھلے نرم دل لیڈر کہلاتے تھے۔ ان کا کردار بڑا مخلصانہ اور پُر اثر تھا۔ گاندھی جی انھیں اپنا سیاسی گرو، مانتے تھے۔ گاندھی جی کے الفاظ میں "ان میں بلور کی سی پاکیزگی، میمنے کی سی رحم دلی، شیر کی سی بہادری تھی اور مہربانی تو اتنی تھی کہ وہ ایک طرح کا الزام بن گئی تھی۔"

کانگریس کے پہلے اجلاس میں شری ہیوم کے بعد جس شخص کی آواز سنائی دی تھی وہ تھے جی، سبرامینم آئر۔ مدراس کے اجلاس میں انھوں نے اخباروں کی آزادی ضبط کرنے کے خلاف زبردست احتجاج کیا تھا۔ بار بار پڑنے والے قحطوں کو روکنے کے لیے وسائل تلاش کرنے پر زور دیا تھا اور کہا تھا کہ ہندوستانیوں کے معاشی وسائل کی ایک آزادانہ جانچ کرائی جانی چاہیے۔ ان کی معلومات جس قدر وسیع تھیں اتنی ہی ان کی نگاہ دور بیں تھی۔ اپنی تحریروں کے سبب انھیں جیل بھی جانا پڑا تھا اور بیمار ہونے پر ہی انھیں آزادی مل سکی تھی۔

قومی بیداری کا دوسرا دور

اب تک ہمارے لیڈروں نے تحریک آزادی کو قانونی حدوں میں رکھا تھا لیکن آہستہ آہستہ انھیں ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس طرح سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اس سے زیادہ کچھ اور کرنا ہوگا۔ بھیک مانگنے سے کچھ نہیں ملتا۔ کچھ پانے کے لیے صلاحیت پیدا کی جاتی ہے اور یہ صلاحیت جدوجہد کر کے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس خیال کے اہم لیڈر تھے لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک۔ وہ صرف لیڈر ہی نہیں تھے بلکہ ایک عالم بھی تھے۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب کے بارے میں ان کی معلومات وسیع تھیں۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ عوام کو انقلاب کے لیے تیار کیے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہی سوچ کر انھوں نے دو ایسے پُرانے تیوہاروں کو جو قریب قریب بند سے ہو گئے تھے، پھر سے شروع کیا۔ یہ تہوار تھے "گنپتی پوجا" اور "شواجی اُتسو"۔ گنپتی پوجا تو مذہبی تیوہار تھا لیکن "شواجی اُتسو" مذہبی نہیں تھا۔ ان موقعوں پر جو اشلوک دوہرائے جاتے تھے اس سے ان کی سچی وطن دوستی ظاہر ہوتی ہے۔ گنپتی پوجا کے اشلوک کا مطلب کچھ اس طرح تھا "ارے، غلام رہ کر بھی تمھیں شرم نہیں آتی! اس سے اچھا تو یہ ہے کہ تم خودکشی کر لو۔ تمہارے ملک کا نام تو ہندوستان ہے تو پھر یہاں انگریزوں کی حکومت کیوں ہے؟"

اور شواجی اشلوک کا مطلب یہ تھا:

لوکمانیہ تلک

"صرف بیٹھے بیٹھے شواجی کے حالات زندگی دوہرانے سے آزادی نہیں مل سکتی۔ ہمیں شواجی اور باجی راؤ کی طرح کمر کس کر جُٹ جانا پڑے گا۔ ہم قومی جنگ کے میدان میں اپنی زندگی کو قربان کر دیں گے۔ اب آپ کو آزادی کے لیے تلوار اور ڈھال اٹھانا ہی پڑے گی۔"

ہر سال کئی کئی دن تک ایسی باتیں عوام کو گھٹی کی طرح پلائی جاتی تھیں۔ تیوہار کے خاتمے پر ملکہ وکٹوریہ کی جے کار کی جاتی تھی تاکہ سرکار کو شک نہ ہو کہ ان تیوہاروں کے بہانے عوام میں بغاوت کے جذبات پھیلائے جا رہے ہیں۔

اس زمانے میں خوفناک قحط بھی پڑ رہا تھا لوکمانیہ تلک نے اسی لیے لگان کی معافی کی تحریک بھی چلائی لیکن سرکار تو ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ منانے کا پروگرام بنا رہی تھی، اس نے لوکمانیہ تلک کی بات پر کان نہیں دھرا۔

اچانک اس زمانے میں بمبئی میں پلیگ پھیلنے لگا۔ اس وبا کا مقابلہ کرنے کے لیے سرکار نے ایک کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی کا مقصد تو عوام کی مدد کرنا تھا لیکن وہ کرتے کیا تھے کہ جو کوئی پلیگ کا شکار ہوتا اسے زبردستی کیمپ میں بھرتی کرا دیتے تھے۔ بھرتی کرانا تو بُرا نہیں تھا لیکن ان کا یہ کام کرنے کا ڈھنگ اور طریقہ بہت غلط تھا۔ لوگ کیمپ میں جانے سے ڈرنے لگے۔ وہ مریضوں کو چھپا دیتے تھے۔ تب کمیٹی اور بھی سختی کرتی تھی۔ گھر گھر کی تلاشی لی جاتی تھی۔ آخر کمیٹی کا ظلم اتنا بڑھ گیا کہ لوگ اس کی نسبت پلیگ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ پلیگ تو صرف مریض کو ہی دکھ دیتا تھا لیکن کمیٹی اس کے سارے کنبے کے لیے آزار کا باعث بنتی تھی یہاں تک کہ ساری بستی کو پریشان کرتی تھی۔ یہ دیکھ کر لوکمانیہ تلک نے اپنے اخبار 'کیسری' میں بڑے زوردار مضامین لکھے۔

لوکمانیہ نے تشدّد کی کبھی پذیرائی نہیں کی لیکن خاموشی سے جبر و ظلم برداشت کرنا بھی ان کے بس کا نہیں تھا۔ اسی دوران ایک ایسا حادثہ ظہور پذیر ہوا جس

کے پیشِ نظر حکومت لوکمانیہ تلک کو اپنا دشمن سمجھنے لگی۔ جس زمانے میں پلیگ کمشنر مسٹر رینڈ کے جبر و ظلم کے سبب فضا ناخوشگوار ہو رہی تھی، اسی زمانے میں ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی منائی گئی۔ پونا میں ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو آدھی رات تک یہ تقریبات جاری رہیں۔ ان کے اختتام کے بعد مدعو حضرات واپس روانہ ہوئے، ان ہی میں مسٹر رینڈ بھی تھے۔ راستے میں اچانک ایک شخص جھاڑیوں میں سے نکلا اور اس نے مسٹر رینڈ پر گولی چلا دی۔ دو دن بعد ہسپتال میں ان کی موت ہو گئی۔ چاروں طرف سنسنی پھیل گئی۔ سرکار کے انگریز عہدیدار پاگل سے ہو اُٹھے۔ شہر پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ جرمانہ کیا گیا اور قاتل کی گرفتاری کے لیے بھی انعام کا اعلان کیا گیا۔ اور آخر میں دو آدمیوں کو پھانسی پر چڑھا کر ہی سرکار مطمئن ہوئی۔ یہ دونوں بھائی تھے اور 'چاپے کر برادرز' کے نام سے تاریخ میں مشہور ہیں۔

حکومت کا خیال تھا کہ اس حادثے کے پیچھے لوکمانیہ تلک، کا بھی ہاتھ ہے، اس لیے انھیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر سازش کا مقدمہ چلا کر انھیں جیل میں ٹھونس دیا گیا اور انھیں معمولی قیدیوں کی طرح رکھا گیا۔ جب یورپی عالموں نے اس کے خلاف احتجاج کیا تب کہیں جا کر انھیں رہا کیا گیا۔

اتنا ہی نہیں۔ جن اخبارات نے اس تحریک کی اشاعت کی تھی ان کے مدیران کو بھی گرفتار کر لیا گیا، ان کی املاک ضبط کر لی گئیں۔ ان سب باتوں کا جنتا پر بڑا بُرا اثر پڑا۔ فرنگی سرکار کے لیے جو بھی احترام کا جذبہ ان کے دل میں تھا، اب کم ہونے لگا۔

اسی زمانے میں دنیا میں کچھ ایسے واقعات ہوئے جس سے ہندوستانیوں کی بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ ۱۸۹۳ء میں جنوبی افریقہ میں 'ایبے سینیا' نامی ملک پر اٹلی نے حملہ کردیا۔ ایبے سینیا، غیر ترقی یافتہ ملک تھا۔ اس کی فوج اور جنگی ہتھیار وغیرہ بھی پرانے ڈھنگ کے تھے جبکہ اٹلی کی فوج جدید طرز کی اور باضابطہ تھی۔ اِس کے پاس جدید ترین ہتھیار تھے لیکن پھر بھی اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اٹلی کی اس شکست سے یہ یقین کہ 'مغرب کی قوت غیر مفتوح ہے'، ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۹۰۴ء میں ایشیا کے ایک چھوٹے سے ملک جاپان نے روس جیسے بڑے ملک کو ہرا دیا۔ اس واقعہ سے ایشیا کی قوموں کی خود اعتمادی جاگ اٹھی۔ وہ سوچنے لگے کہ جب جاپان جیسا چھوٹا سا ملک روس جیسے بڑے ملک کے دانت کھٹے کرسکتا ہے تو ہندوستان تو بہت بڑا ملک ہے، وہ بھلا انگریزوں کا غلام کیوں بنا ہوا ہے؟

انھیں دنوں مصر، فارس، ترکی اور روس میں آزادی کے لیے جدوجہد ہوئی۔ کامیابی بھی ملی۔ ان سب کی کہانی سُن سُن کر ہندوستانی جنتا کی ہمت بلند ہوئی اور وہ غلامی سے نجات حاصل کرنے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔

تاریخ کا یہ لمحہ عجیب تھا۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے ملک اپنی آزادی کے لیے طاقتور ملکوں سے ٹکرا رہے تھے۔ سوال بڑی طاقت اور چھوٹی طاقت کا اتنا نہیں تھا، جتنا چھوٹے ملکوں میں آزادی کے لیے تڑپ تھی۔ آزادی کی تڑپ اتنی بڑی طاقت ہے جس کے سامنے بڑی سے بڑی قوت ناکام ہو جاتی ہے۔ ورنہ یہ حیرت انگیز ہے کہ جاپان، مصر، فارس اور ترکی جیسے غیر ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں بڑے سے بڑے ملکوں کی فوج ناکام ثابت ہوئی۔ ہندوستان کے لیے تاریخ کی یہ مثال اس لیے بھی اہم تھی کہ اسے پہلی بار یہ سبق ملا کہ آدمی آزاد ہو سکتا ہے۔ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے اور اس حق کو حاصل کرنے کے لیے جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ آزادی کی اس لڑائی میں آدمی کا جذبہ اور خلوص ہی سب سے اہم ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو آدمی کی روح سے متعلق ہے۔ ایک بار جب انسان کی روح جاگ جاتی ہے تو اسے کوئی بھی باہری طاقت پھر نہیں سُلا سکتی، اسے شکست نہیں دے سکتی۔ آزادی کی یہ کہانی اس دور کے ہندوستانیوں کے لیے ایک جادو ثابت ہوئی۔ اس جادو نے انھیں اس طرح جگایا کہ ان کے تنِ مردہ میں نئی زندگی اور نئی قوت پیدا ہوگئی۔ اسی قوت کے سہارے ہندوستانیوں نے آزادی کی لڑائی لڑنی شروع کی۔ یہ ایک ایسی لڑائی تھی جس میں دنیا کی ساری انسانیت ان کے ساتھ تھی۔

بنگال کی تقسیم

جس زمانے میں ملک میں قحط، پلیگ اور زلزلوں کی وجہ سے بے اطمینانی بڑھ رہی تھی، اسی زمانے میں وائسرائے لارڈ کرزن نے ایک ایسا کام کیا جو کہ اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا ثابت ہوا۔ یوں تو انھوں نے بہت سے ایسے قانون بنائے جن سے ہندوستان کو نقصان پہنچا لیکن یہ کام تو ایسا تھا کہ جنتا اب اور سہہ نہیں سکتی تھی، عوام اس ٹھوکر سے تلملا اُٹھے۔

لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کرنے کا پروگرام بنایا۔ بنگال کے دو ٹکڑے کیے جانے تھے۔ مشرقی ضلع ڈھاکہ، راج شاہی اور چٹاگانگ کو آسام کے ساتھ ملاکر ایک صوبہ بنایا جانے والا تھا جس کا نام مشرقی بنگال اور آسام، رکھا جانے والا تھا۔ بقیہ حصہ اڑیسہ کے ساتھ مل کر 'بنگال' نام کا دوسرا صوبہ بننے والا تھا۔

ایسا ارادہ کیوں کیا گیا؟ سرکار کا کہنا تھا کہ اس طرح حکومت کو انتظامات کرنے میں سہولت ہوگی لیکن سچائی کچھ اور ہی تھی۔ حقیقت میں سرکار عوام کے ابھرتے ہوئے قومی جذبے کو کچلنا چاہتی تھی اور چاہتی تھی کہ ہندو مسلمان میں پھوٹ ڈال کر ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کردے۔ حکومت نے یہ کھیل بڑی چالاکی سے کھیلا۔ حکومت کے اہلکاروں نے اس بات کی تشہیر کی کہ بنگال کی تقسیم ہو جانے کے بعد مشرقی بنگال اور آسام کے صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ متحد بنگال میں ان کی تعداد کم ہے، اس وجہ سے انھیں سب ہی سہولتیں نہیں

مل پاتیں۔ اس پالیسی پر عمل کرکے ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانا چاہا۔

کانگریس کو برٹش حکومت کے ارادے کا پتہ چل گیا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ حکومت عوام کے جذبات کو مدِ نظر رکھے گی اور ایسا نہیں کرے گی۔ اس وقت تک کانگریس گرم اور نرم دو گروہوں میں بٹ چکی تھی۔

گرم گروہ کے لیڈر لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک ، لالہ لاجپت رائے اور بپن چندر پال تھے۔ یہ لال بال پال کے نام سے مشہور تھے۔ دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے وغیرہ نرم کانگریس کے لیڈر تھے لیکن بنگال کی تقسیم کی سب ہی نے مل کر مخالفت کی۔

انھوں نے برٹش مال کے بائی کاٹ فیصلہ کیا۔ بنگال کے ایک نیتا کرشن کمار مترنے لوگوں سے اپیل کی "مادرِ ہند کے نام پر ہم لوگوں کو صرف سودیشی اشیاء کا ہی استعمال کرنا چاہیئے۔ ہمیں قسم کھانی چاہیئے کہ مستقبل میں اگر ہمیں سودیشی چیزیں ملیں گی تو بدیسی مال کو قطعی استعمال نہیں کریں گے۔ اس کے لیے چاہے کتنی بھی مشکلات کا مقابلہ کیوں نہ کرنا پڑے۔"

سرکار پر اب بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے اپنے پروگرام کے مطابق ۱۶؍ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو بنگال کے دو ٹکڑے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس وقت رابندر ناتھ ٹھاکر نے عوام سے اپیل کی "سرکار تو ہمیں الگ الگ کرنے پر تلی ہے لیکن ہم لوگ دل سے الگ نہیں ہو سکتے۔ ۱۶؍ اکتوبر کے دن ہم راکھی باندھیں کیونکہ راکھی اتحاد کا نشان ہے۔"

ایک دوسرے قلمکار نے کہا۔

بپن چندر پال

رونیدر ناتھ ٹھاکر

"اس دن کسی بھی گھر میں چولہا نہ جلایا جائے سب لوگ فاقہ کریں۔"

عوام نے ان اپیلوں کا دل سے استقبال کیا۔ ۱۶؍ اکتوبر کا دن سارے بنگال میں "یوم ماتم" کے طور پر منایا گیا۔ صبح ہوتے ہی مرد عورت گروہ در گروہ "وندے ماترم" گاتے ہوئے گھروں سے نکل پڑے۔ راستے

ہیں انھیں جو بھی ملتا، اس کے راکھی باندھ دیتے۔ ہزاروں لوگوں نے اس دن فاقہ کیا۔ شام کے وقت احتجاج کرنے کے لیے جگہ جگہ جلسے کیے گئے۔ ایک جلسے میں تو ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ اس زمانے کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی۔ اس جلسے میں سودیشی سامان تیار کرنے کے لیے ایک فنڈ قایم کرنے کی تجویز پاس کی گئی۔ پچاس ہزار روپے تو اسی وقت جمع ہو گئے۔

سرکار یہ سب دیکھ کر بوکھلا اٹھی۔ مشرقی بنگال کے لفٹیننٹ گورنر سر بیم فیلڈ فلر نے لیڈروں کو بلا کر بھیانک دھمکیاں دیں۔ کہا "اس تحریک کو دبانے کے لیے گورکھا پلٹن کو استعمال کیا جائے گا۔"

'وندے ماترم' گیت گانے پر بھی پابندی لگا دی گئی لیکن اس سے تو تحریک میں اور بھی گرمی اور تیزی آ گئی۔ جنتا اور بھی جوش و خروش کے ساتھ 'وندے ماترم' کا ورد کرنے لگی۔ سرکار نے لاٹھی اور گولی سے کام لیا، کوڑے لگوائے گئے لیکن یہ سُر بند نہیں ہو سکا۔

اسی زمانے میں 'باری سال' میں ایک مجلس ہوئی۔ پولس نے منتظمین کو بلا کر کہا "آپ لوگ 'وندے ماترم' کا نعرہ یہاں نہیں لگائیں گے۔" منتظمین نے اس بات کو منظور کر لیا لیکن جب نمائندوں کو یہ پتہ لگا تو وہ بہت ناراض ہوئے، انھوں نے طے کیا کہ وہ 'وندے ماترم' کا نعرہ ضرور لگائیں گے۔ اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن جیسے ہی یہ لوگ 'وندے ماترم' پکارتے ہوئے جلسہ گاہ کی طرف بڑھے، ویسے ہی پولیس نے ان پر حملہ کر دیا اور تڑاتڑ لاٹھیاں برسانے لگی۔ اس وقت یہ لوگ اور بھی زوروں سے 'وندے ماترم' گانے لگے پولس نے سریندر ناتھ بنرجی کو گرفتار کر لیا لیکن جرمانے کی ادائیگی کر کے وہ پھر جلسے میں آ پہنچے۔ اس جلسے میں سرکار کے دباؤ اور مظالم کی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی۔

دوسرے دن جلسہ نہیں ہو سکا۔ پولس وعدہ مانگتی تھی کہ 'وندے ماترم' کا نعرہ نہیں لگایا جائے گا لیکن نمائندوں کا ایک ہی جواب تھا "ہم کوئی وعدہ نہیں کریں گے۔"

اس حادثے سے تحریک میں اور بھی توانائی آ گئی۔ آہستہ آہستہ بنگال کے اس سوال کو سارے ہندوستان نے اپنا سوال بنا لیا۔

اس وقت جذبۂ آزادی بہت بڑھ چکا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی دیوانے سے ہو گئے تھے۔ کالج کے طلبا نے تو ولائتی کاغذ کی بنی ہوئی کاپیوں پر امتحان میں سوالوں کے جواب لکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

آزادی کی تڑپ ایسی ہی ہوتی ہے۔ لوگ اس زمانے میں مغربی تعلیم سے نفرت کرنے لگے تھے۔ انھوں نے 'بنگ جاتی ودّیا پریشد' کے نام سے ایک ادارہ قایم کیا۔ اس ادارے نے ایک لاکھ روپیہ جمع کر کے نئے اسکول اور کالج کھولے۔ صرف مشرقی بنگال میں ہی ایسے ۴۲ اسکول کھولے گئے۔ قومی تعلیم کے ساتھ ساتھ 'سودیشی' تحریک بھی تیزی سے بڑھی۔ کرگھا صنعت میں جیسے ایک بار پھر جان پڑ گئی۔

پُرتشدّد تحریک کی ابتدا

بنگال کی تقسیم کی مخالفت میں عوام پوری شدت سے اپنی نفرت کا اظہار کر رہے تھے لیکن اس بات کا نتیجہ نکلتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ سرکار نے بنگال کے نو عوامی لیڈروں کو دیش نکالا دے دیا تھا اور اندولن کرنے والوں پر نئے سے نئے ظلم ڈھائے جا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر نوجوانوں کے دل میں ایک سوال اٹھا کہ کیا ہمیں کوئی دوسرا راستہ تلاش نہیں کرنا چاہیئے؟ ظالم احتجاج اور برداشت کی زبان نہیں سمجھتے۔ وہ صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں نوجوانوں نے سوچا اس لیے ہمیں بھی ہتھیاروں سے سرکار کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

نوجوانوں کو اٹلی کی جدوجہد آزادی سے یہ سبق ملا تھا۔ اُس زمانے میں خفیہ انجمنیں ملک کی آزادی کے لیے انقلابی کام کر رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے بنگال میں جگہ جگہ ٹریننگ سینٹر کھل گئے۔ ان سینٹروں میں ملک کی سیاست پر بحث تو ہوتی ہی تھی اس کے ساتھ ساتھ اسلحہ کے استعمال کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہ بتایا جاتا تھا کہ آزادی کی نعمت پانے کے لیے ان گنت لوگوں کو اپنا خون بہانا پڑتا ہے۔

عوام میں بیداری لانے کے لیے اخبارات بڑا کام کرتے تھے۔ بنگال میں ایسے تین اخبار تھے 'بندے ماترم'، 'سندھیا'، اور 'یُگانتر'۔ 'بندے ماترم' کے مدیران میں مشہور لیڈر بپن چندر پال بھی تھے۔ اس میں لکھنے والوں میں اربندو گھوش
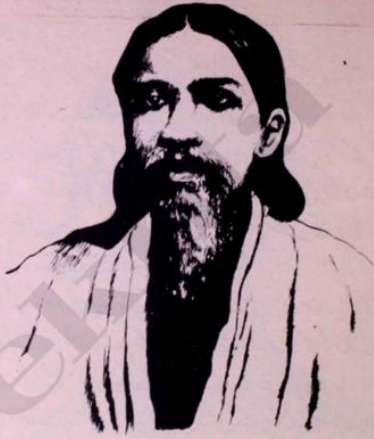
اربندو گھوش

کا نام پیش پیش تھا جنھوں نے کچھ مدت بعد پانڈیچری میں اپنا آشرم کھولا۔ لیکن اس زمانے میں تو وہ ایک انقلابی کے طور پر مشہور تھے۔ ان کے مضامین کا لب لباب یہی رہتا تھا کہ سرکار کے آگے گڑگڑانے سے کچھ نہیں ملے گا۔ انھوں نے اپنی بیوی کو ایک خط میں لکھا تھا "جہاں دوسرے لوگ ملک کو اس کے کھیت کھلیان، جنگل دریا اور پہاڑوں کی وجہ سے بنیادی اہمیت دیتے ہیں، وہاں میں اپنے وطن کو اپنی ماں تسلیم کرتا ہوں۔ اس لیے ماں کی چھاتی پر بیٹھ کر اگر کوئی راکشس اس کا خون بہانا چاہے تو اُس وقت اس کے بیٹے کا کیا فرض ہے؟ بے فکر ہو کر بیٹھا رہے، بیوی بچوں کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھائے یا ماں کو بچانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو۔!"

'یگانتر' کے ایڈیٹر سوامی وویکانند کے چھوٹے بھائی بھوپیندر ناتھ دت تھے۔ اس اخبار میں کھلے طور سے تشدّد کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ اس اخبار کے خریداروں کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ بھلا سرکار اس بات کو کیسے برداشت کرسکتی تھی؟ اس نے دت کو گرفتار کر کے جیل میں بند کردیا۔ یہ خبر جب ان کی بوڑھی ماں کو ملی تو انھوں نے آنسو نہیں بہائے بلکہ خوشی کا اظہار کیا اور بنگال کی پانچ سو عورتیں انھیں مبارکباد دینے کے لیے ان کے گھر گئیں۔

اربندو بھی گرفتار کر لیے گئے۔ ان کے مقدمے میں بپن چندر پال کو گواہی دینے کے لیے بلایا گیا لیکن انھوں نے انکار کردیا۔ سرکار نے ان کو بھی گرفتار کرلیا۔ اس پر طلبا جوش میں بھر گئے۔ انھوں نے عدالت کے سامنے مظاہرہ کیا۔ اس وقت سُشیل سین نامی طالب علم کو گرفتار کر کے چھڑی سے پیٹا گیا اور بپن چندر پال کو چھ مہینے کی سزا دیدی گئی۔

ملک بھر میں جلسے جلوسوں پر پابندی تھی۔ اس کا نتیجہ یہی ہوسکتا تھا کہ جو کام کھلے طور پر نہیں ہوسکتا اسے چوری چھپے کیا جائے۔ سرکار کے ظلموں سے نوجوان اتنے غصّے میں آئے کہ مرنے مارنے پر تل گئے۔

انگریز عہدیداروں کے مارنے کی کئی کامیاب اور کئی ناکام کوششیں ہوئیں، دو لڑکوں، پرفل چاکی اور خودی رام بوس نے ۳۰ر اپریل ۱۹۰۸ء کو ایک انگریز افسر پر حملہ کیا۔ وہ تو بچ گیا لیکن غلطی سے دو ماں بیٹیاں ماری گئیں۔ پرفل چاکی نے خودکشی کرلی اور خودی رام بوس کو گرفتار کر کے پھانسی دیدی گئی۔ اس کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی۔ اس بہادر لڑکے کو پھانسی پاتا دیکھ کر سارا ملک تھرّا اُٹھا۔ گھر گھر میں اس کی پوجا ہونے لگی۔

پرفل چاکی

کچھ دن بعد پولس نے کلکتہ کے مانک تلّہ میں بم بنانے کے ایک کارخانے کا پتہ لگایا۔ اس سلسلے میں ۳۴ اشخاص گرفتار کیے گئے۔ ان میں اربندو بھی تھے۔ یہ مقدمہ 'علی پور سازش کیس'، کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقدمے میں اربندو کی طرف سے پیروی کرنے پر بیرسٹر چترنجن داس کو شہرت ملی۔ اربندو کو بچانے کے لیے انھوں نے

اپنی جان لڑادی ۔ فیس کے طور پر ایک پیسہ بھی نہیں لیا بلکہ مقدمے کا خرچ چلانے کے لیے اپنی گھوڑا گاڑی تک فروخت کردی ۔

یہ آندولن بنگال ہی تک محدود نہ رہا ۔ دوسرے صوبوں میں بھی آتش فشاں پھوٹ پڑا ۔ پنجاب میں کچھ ایسے حادثات ہوئے جن کے سبب وہاں بھی تحریک آزادی میں شدّت آگئی ۔ پنجاب کے اخبارات نے ان حادثات پر زوردار اداریے لکھے اور نکتہ چینی کی ۔
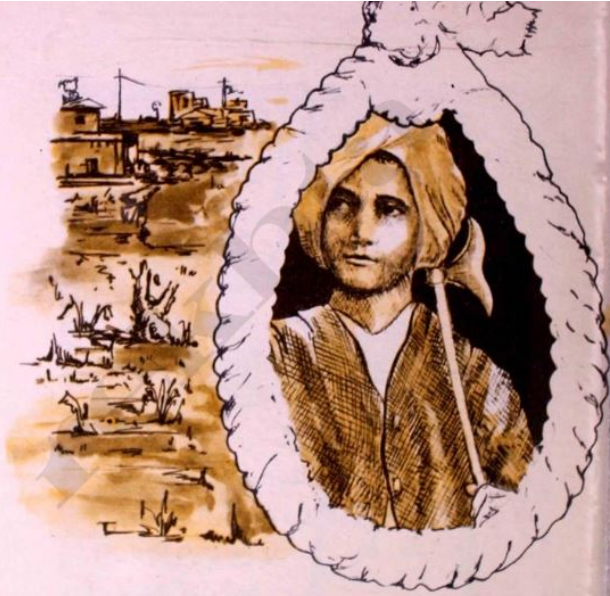
خودی رام بوس

اس زمانے میں پنجاب میں لالہ لاجپت رائے کا بول بالا تھا ۔ کانگریس کے ساتھ ساتھ وہ 'آریہ سماج' کے بھی ایک مشہور لیڈر تھے ۔ لاہور کے مشہور و معروف ڈی اے وی کالج کے بانیوں میں لالہ جی بھی تھے ۔ وہ درجہ اول کے وکیل اور صحافی بھی تھے ۔ لوکمانیہ تلک اور بپن چندر پال کی طرح لالہ لاجپت رائے

بھی انگریزوں کے خلاف پرچار کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے لیے انھوں نے پورے پنجاب کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ دوسرے نوجوان بھی میدان میں آگئے۔ ان میں ایک سردار اجیت سنگھ بھی تھے۔ مشہور انقلابی بھگت سنگھ ان ہی کے بھتیجے تھے۔ سرکار نے ۱۴ مئی ۱۹۰۷ء کو ان دونوں کو گرفتار کر لیا اور جلا وطن کر کے مانڈلے بھیج دیا۔

اب تو پنجاب میں جیسے لوگ پاگل ہو گئے۔

"نہس جا فرنگیا، ہٹ جا دور نگیا — آٹھ نو گورا، لڑے جاٹ دا دو چھورا"
(دو روپ والے فرنگی دفع ہو جا — آٹھ نو گوروں سے جاٹ کے دو لڑکے لڑ سکتے ہیں)
جیسے جوشیلے نعروں سے سڑکیں گونجنے لگیں اور یہ گیت بھی بنگال کے 'وندے ماترم' کی طرح بے حد مقبول ہوا۔

پگڑی سنبھال او جٹا، پگڑی سنبھال اوئے
اینا فرنگیاں تیرا لُٹ لیا مال اوئے

ماجھے دے زور نال، مالوے دے شور نال، کدی نٹیاں ہارنا
نِریاں گلاں نال کچھ نئیں بندا
اُٹھ علاج کر کوئی وطن دا
بازیاں لٹی جاندا دیکھ بنگال اوئے

(او جاٹ، اپنی عزت کی حفاظت کر۔ فرنگیوں نے تجھ پر ڈاکہ ڈال دیا ہے لیکن ہمیں کبھی شکست نہیں ہو سکتی۔ خالی باتوں سے کچھ نہیں ہو سکتا، اُٹھ اور آزادی کے لیے کچھ کام کر ورنہ دیکھ بنگال بازی جیت لے گا)

مہاراشٹر میں اس وقت لوکمانیہ تلک عوامی لیڈر تھے۔ وہ اپنے اخبار 'کیسری'

لالہ لاجپت رائے

میں ہندوستانی قومیت اور وطنی خیالات کی اشاعت کر رہے تھے۔ تلک تشدد کے حامی نہیں تھے لیکن حکومت نے انھیں بھی گرفتار کر لیا اور ایک ہزار روپے جرمانے کے ساتھ ساتھ چھ سال کی جلا وطنی کی سزا دی۔ سزا سنانے کے بعد جج نے ان سے

پوچھا "آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟" اس پر انھوں نے کہا:

"جیوری کے اس فیصلے کے باوجود میں کہتا ہوں کہ میں بے قصور ہوں۔ ایک ایسی قوت بھی ہے جو اس ساری دنیا کو چلاتی ہے۔ ممکن ہے اسی طاقت کی یہ مرضی ہو کہ جو کام مجھے عزیز ہیں وہ آزاد رہنے کی نسبت، جیل میں تکالیف اُٹھانے سے زیادہ پھلیں پھولیں۔"

اس دور میں مہاراشٹر میں بھی ایسے لیڈر تھے جو سیاسی قتل و غارتگری میں زیادہ یقین رکھتے تھے۔ سرکار ان پر بھی ٹوٹ پڑی۔ ایسے ہی ایک نیتا گنیش دامودر ساورکر تھے۔ ان کی شاعری کی ایک کتاب کی بنا پر ہی مجسٹریٹ نے انھیں کالے پانی کی سزا دیدی۔

کنائی لال

لیکن چھ ماہ بعد جب وہ فرنگی مجسٹریٹ اس ملک سے رخصت ہو رہا تھا، کسی نے اسے گولی مار دی۔ وائسرائے لارڈ منٹو پر بھی حملہ کیا گیا۔

یہ آندولن صرف ہندوستان ہی تک محدود نہیں رہا۔ دوسرے ممالک میں بھی انقلابی اپنا کام کر رہے تھے۔ انگلینڈ میں یہ کام شری کرشن ورما نے شروع کیا تھا۔ بعد میں شری ونایک دامودر ساورکر بھی جو تاریخ میں 'ویر ساورکر' کے نام سے مشہور ہوئے، وہاں پہنچ گئے۔ شری شیام جی کرشن ورما نے 'انڈین ہوم رول سوسائٹی' کو قایم کیا تھا۔ ساورکر اس سوسائٹی کے کاموں میں گہری دلچسپی لیتے تھے اور پوشیدہ طور سے ہندوستان ہتھیار بھیجنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ سر ولیم کرزن وائلی جسے مدن لال ڈھینگرہ

نے گولی ماری تھی، وہ انھیں کا ساتھی تھا۔ برٹش سرکار نے دھینگڑہ کو پھانسی پر لٹکا دیا اور ساورکر کو گرفتار کر کے ہندوستان بھیج دیا، یہاں انھیں کالے پانی کی سزا دی گئی۔

مشہور انقلابی لالہ ہردیال نے امریکہ میں انقلابی جماعت بنائی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران سرکار نے انھیں گرفتار کر لیا، لیکن وہ ضمانت پر رہا کر دیے گئے۔ اس کے بعد وہ چپکے سے سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ یہ سب انقلابی بہت بہادر، مخلص اور بڑے محبِّ وطن تھے۔ انگریز افسران بھی دل سے ان لوگوں کی عزّت ہی کرتے تھے۔

بنگال کے مشہور انقلابی کنائی لال کو جب پھانسی دیدی گئی تو ان کی لاش لینے کے لیے کچھ لوگ جیل کے دروازے پر پہنچے۔ ایک گورا افسر انھیں اندر لے گیا۔ کچھ دور جاکر اس نے ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ سر سے پیر تک کمبل سے ڈھکی ایک لاش وہاں رکھی تھی، وہ کنائی ہی کی لاش تھی، اسے دیکھ کر سب رونے لگے۔ اس وقت اس گورے نے کہا "آپ روتے کیوں ہیں؟ جس ملک میں ایسے بہادر پیدا ہوتے ہیں، وہ ملک قابل مبارکباد ہے۔ مرتے تو سب ہی ہیں لیکن ایسی موت کتنوں کو نصیب ہوتی ہے!"

اس کے منہ سے ایسے الفاظ سُن کر سب ہی لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ لیکن پھر بھی یہ آندولن کامیاب نہیں ہوا۔ اس دور کے لوگ تشدد کے اس راستے کو زیادہ پسند بھی نہیں کرتے تھے اور کسان مزدور اکثریت اس راستے سے بہت دور تھی۔ اس لیے یہ باہمت محبان وطن دلوں میں آزادی کی تڑپ تو پیدا کر سکے لیکن کسی مخصوص راستے کی نشاندہی نہ کر پائے۔

کانگریس نئے راستے پر

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اب تک کانگریس دو گروہوں میں بٹ چکی تھی۔ گرم اور نرم۔ اس زمانے کا گرم گروہ صرف اتنا ہی چاہتا تھا کہ سرکار پر دباؤ ڈالنے کے لیے کوئی زوردار سیاسی آندولن کرنا چاہیے۔ بنگال کی تقسیم کی مخالفت دونوں گروہوں نے کی تھی۔ اس سال کانگریس کے صدر نرم گروہ کے نیتا گوپال کرشن گوکھلے تھے۔ کانگریس نے فیصلہ کیا کہ گوکھلے انگلینڈ جائیں اور ہندوستان کے لیے ایک اچھی پالیسی اپنانے کے سلسلے میں برٹش حکومت پر زور ڈالیں۔

گوکھلے انگلینڈ گئے لیکن ناکام واپس آئے۔ ان کی اس ناکامی کے سبب عوام کا رجحان گرم گروہ کی طرف اور زیادہ ہو گیا۔ گرم گروہ کی مقبولیت بڑھ گئی۔ اس لیے ۱۹۰۶ء کے اجلاس میں بہت جوش نظر آیا۔ دونوں گروہوں نے متفق رائے ہو کر دادا بھائی نوروجی کو اپنا صدر چُنا۔ اس اجلاس میں دادا بھائی نے پہلی بار لفظ "سوراجیہ" کا استعمال کیا اور کہا "آندولن کرو۔ ان تھک آندولن کرو لیکن یہ آندولن پُرامن ہونا چاہیے اور اس میں بے ضابطگی قطعی نہیں ہونی چاہیے"۔

آئندہ اجلاس تک گرم دَل کا اثر اور بڑھ گیا۔ سرکاری نوکریوں اداروں اور جگہوں کے بائی کاٹ کی تحریک نے بھی زور پکڑا۔ نئے صدر کے مسئلے پر

دادا بھائی نوروجی

بھی کافی کھینچا تانی ہوئی۔ جب لالہ لاجپت رائے نے صدرِ کانگریس بننے سے
انکار کردیا تو نرم کانگریس نے راس بہاری گھوش کے صدر ہونے کا اعلان

کردیا۔ گرم دَل نے اس بات کو قبول نہیں کیا اور دیکھتے دیکھتے اجلاس میں
طوفان سا آگیا۔ نال جڑا ایک لال رنگ کا مراٹھا جوتا سریندر ناتھ بینرجی کے
گال پر لگتا ہوا سرفیروز شاہ مہتہ کے اوپر جاگرا۔ اس پر بھگدڑ سی مچ گئی۔ صرف
لوکمانیہ تلک مردِ آہن کی طرح سینے پر بازو باندھے بہادری سے کھڑے رہے۔
اس افراتفری میں کچھ لوگ لوکمانیہ تلک کی طرف ڈنڈے گھماتے دوڑے تو
ان کے سب سے بڑے مخالف گوکھلے دیوار بن کر ان کے سامنے جا کھڑے
ہوئے اور ان کی حفاظت کی۔

اس حادثے سے ان دونوں گروہوں کا یکجا ہونا ناممکن ہوگیا لیکن اگلے
کئی برسوں تک کانگریس پر نرم دَل کا ہی قبضہ رہا۔ لاہور میں ۱۹۰۹ء میں ہونے

والے اجلاس کے صدر پنڈت مدن موہن مالویہ تھے۔ یہ اجلاس اس لیے قابل تذکرہ تھا کہ اس زمانے میں برٹش سرکار نے "منٹو مارلو اصلاحات" کے نام سے کچھ نئے سدھار پیش کیے تھے۔ لیکن کانگریس نے ان اصلاحات کی مذمت کی، کیونکہ ان کے ذریعے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔

"منٹو مارلو اصلاحات، کیا تھیں؟ در اصل ان کے ذریعے کسی حد تک چناؤ کا اصول مان لیا گیا تھا۔ ممبران کی تعداد بھی بڑھادی گئی تھی لیکن پھر بھی قانون ساز اسمبلیوں میں چنے ہوئے ممبران کی اکثریت نہیں ہوتی تھی۔ ممبران کو بجٹ کے وقت تجاویز پیش کرنے کا حق تو دیدیا گیا تھا لیکن اس میں ایک خطرناک بات پیدا کردی گئی تھی جس سے آگے چل کر ملک کو بہت نقصان پہنچا۔ ووٹران کو کئی حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے لیے کچھ سیٹیں مقرر کردی گئی تھیں۔ جو ہندو سات ہزار روپے مالگزاری ادا کرتا تھا صرف وہی ووٹ دینے کا حقدار تھا جبکہ مسلمانوں کو یہ حق صرف سات سو پچاس روپے مالگزاری ادا کرنے پر مل جاتا تھا۔ اس طرح مسلمانوں کو ایک الگ قوم کے طور پر کچھ رعائتیں دے کر دو قومی نظریہ کی تخلیق کی گئی، جس کی وجہ سے ہندو مسلمانوں میں ایک خلیج سی پیدا ہوگئی جو بڑھتی ہی گئی۔

ان اصلاحات میں یہ بات بھی منظور کرلی گئی تھی کہ ہندوستانی حکومت میں ایک ہندوستانی بھی لیا جائے گا۔ بہت بے اطمینانی پھیلی تو ہندوستانیوں کو چھوٹے موٹے حق اور اختیارات دینا منظور کرلیا گیا۔ ان اصطلاحات سے ہندوستانیوں کو کیا ملا؟۔ ہندو مسلمانوں میں پھوٹ پڑگئی، نرم دَل اور گرم دَل دونوں ایک دوسرے سے دور چلے گئے کیونکہ نرم گروہ ان اصلاحات سے کافی مطمئن تھا جبکہ گرم گروہ ان سے بے حد غیر مطمئن تھا۔ آپس کے یہ اختلافات فرنگی سرکار کے لیے نعمت تھے۔ وہ نرم گروہ کو اپنے ساتھ ملاکر گرم دَل والوں اور جوشیلے انقلابیوں کی سرکوبی کرسکتی تھی۔ اسی رویے کو کہتے ہیں "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" والی سیاست! ۱۹۱۰ء میں سر ولیم ہیڈر برن کانگریس کے صدر بنے۔ انھوں نے ہندو مسلمانوں اور کانگریس کے دونوں گروہوں کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی بے حد کوشش کی لیکن افسوس کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔

دلّی دربار اور بنگال کی تقسیم کا اختتام

اسی زمانے میں (۱۹۱۰ء کے اواخر میں) لارڈ ہارڈنگ ہندوستان کے وائسرائے بن کر آئے۔ اس وقت یورپ کی حالت بہت اچھی نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کسی بھی وقت جنگِ عظیم شروع ہوسکتی ہے۔ اس لیے برٹش سرکار اب ایسا رویّہ اپنانا

چاہتی تھی جس سے ہندوستان کا تعاون حاصل ہو سکے۔ یہ سوچ کر وائسرائے نے اگلے برس دلّی میں ایک شاہی دربار منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ اس دربار میں خود شہنشاہ جارج پنجم اور ملکہ عالیہ میری بہ نفس نفیس شریک ہونے والے تھے۔

حکومت یہ سمجھ گئی تھی کہ جب تک بنگال کی تقسیم ختم نہیں کی جائے گی اس وقت تک ملک میں پورے طور سے امن قایم نہیں ہو سکے گا۔ شہنشاہ کے تخت نشین ہونے

کے موقعے کا فائدہ اٹھاکر یہ کام آسانی سے کیا جاسکتا تھا۔ اس طرح فرنگی سرکار کی شان میں بٹہ بھی نہیں لگتا تھا۔

یہ شاہی دربار بڑی شان شوکت کے ساتھ دلّی میں ہوا۔ سب ہی راجا مہاراجا، افسران اور معززین ملک اس دربار میں شریک ہوئے۔ شہنشاہ کی طرف سے دربار میں دو اہم اعلان کیے گئے۔ پہلا ہندوستان کی راجدھانی کلکتہ سے دلّی بدلدی جائے گی اور بنگال کی تقسیم ختم کرکے بنگال کو خود ایک مستقل صوبہ بنا دیا جائے گا، جس کا گورنر بھی الگ ہوگا۔ ہندوستانیوں کو خوش کرنے کے لیے یہ کسی حد تک ایک صحیح قدم تھا۔ کلکتہ میں کانگریس کا ۲۶ واں اجلاس ہوا تو فرنگی سرکار کے اس اقدام کے لیے بڑی مسرّت کا اظہار کیا گیا۔

لیکن لوگ اب بھی پرانے مظالم کو نہیں بھولے تھے اور پھر ہندوستان میں بننے والے کپڑے پر سے ٹیکس بھی ہٹایا نہیں گیا تھا۔

کانگریس کے لیڈروں نے لوگوں کو تنبیہہ کی کہ چند اصلاحات سے ہی خوش نہ ہوجائیں اور آہستہ روی کی پالیسی کو بھی ختم کردیں چونکہ اس سے آزادی کی منزل دور ہی ہوتی جائے گی۔

آزادی کی کہانی بہت لمبی ہے۔ ہر کہانی میں کئی موڑ آتے ہیں۔ اب ہندوستان ایک نئے موڑ کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ بنگال کی تقسیم کرکے برٹش سرکار جو ناانصافی کرنا چاہتی تھی اسے روکنے میں ہم کامیاب ہوگئے تھے۔ ہمیں اپنی قوت کا احساس ہوگیا تھا لیکن آزادی حاصل کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ منزل ابھی بہت دور تھی اور راستہ مشکل!

اس سلسلے کی دوسری کتابیں

باپو (باتصویر — دو حصّوں میں)	ایف، سی، فرنیٹاس
کشمیر	مالا سنگھ (تصاویر پرمیانند شرما)
پرندوں کی دنیا	جمال آرا
ہماری ندیوں کی کہانی (حصّہ اوّل)	لیلا مجمدار
ہمالہ کی چوٹیوں پر	برگیڈیر گیان سنگھ
جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں	لیلا دتی بھاگوت
رسیلی کہانیاں	منوج داس
آزادی کی کہانی (حصّہ اوّل)	وشنو پربھاکر
ہماری ریلیں	جگجیت سنگھ
ہندوستان میں غیرملکی سیاح	کے، سی، کھنّہ
آؤ ناٹک کھیلیں	اوما آنند
خالہ بی کا خاندان	ایم، ڈی، چترویدی

ہر کتاب کی قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

یہ سب کتابیں انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔

اس سلسلے کی دوسری کتابیں

کتاب	مصنف
باپو (باتصویر — دو حصّوں میں)	ایف ، سی ، فرینا س
کشمیر	مالا سنگھ (تصاویر پرمیانند شرما)
پرندوں کی دنیا	جمال آرا
ہماری ندیوں کی کہانی (حصّہ اوّل)	لیلا مجمدار
ہمالہ کی چوٹیوں پر	برگیڈیر گیان سنگھ
جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں	لیلا دتی بھاگوت
رسیلی کہانیاں	منوج داس
آزادی کی کہانی (حصّہ اوّل)	وشنو پربھاکر
ہماری ریلیں	جگجیت سنگھ
ہندوستان میں غیر ملکی سیاح	کے ، سی ، کھنہ
آؤ ناٹک کھیلیں	اوما آنند
خالہ بی کا خاندان	ایم ، ڈی ، چترویدی

ہر کتاب کی قیمت : ایک روپیہ پچاس پیسے

یہ سب کتابیں انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔